12

علم سیکھنے کی تڑپ، قوتِ عملیہ اور تدبّر وفکر کی عادت مومن کا خاص شیوہ ہے

(فرمودہ 2؍اپریل 1948ء بمقام رتن باغ لاہور)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"انسانی زندگی کے ہر حصہ کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں اور ہر حصہ میں کچھ کمزوریاں اور کچھ اچھی باتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً بچپن کی زندگی ہے۔ جہاں بچپن کی زندگی میں جسمانی کمزوری پائی جاتی ہے، نسلی کمزوری پائی جاتی ہے، سنجیدگی کی کمی پائی جاتی ہے وہاں بچپن میں سیکھنے کی خواہش انتہا درجہ کی موجود ہوتی ہے۔ شاید انسانی زندگی کے مختلف اَدوار میں سے کسی ایک دَور میں بھی سیکھنے کی خواہش اِتنی شدید نہیں ہوتی جتنی بچپن کی زندگی میں ہوتی ہے۔ وہ بیسیوں باتیں جن کو سن کر بڑے آدمیوں کے دلوں میں کبھی یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ وہ کیوں ہیں؟ کس لیے ہیں؟ اُن کی کیا تشریح ہے؟ اور ان کا کیا مقصد ہے؟ بچہ اُن باتوں کو سن کر یا دیکھ کر فوراً جرح شروع کر دیتا ہے۔ ہر ابتدائی تغیر پر، ہر آسمانی تبدیلی پر، زمینی آواز یا زمینی نظارے کا جو فرق ہوتا ہے اِس پر بچہ فوراً سوال کر دیتا ہے کہ اماں! یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ یہ کس لیے ہے؟ حقیقتاً اگر مائیں تعلیم یافتہ ہوں تو بچے سکول میں جانے سے پہلے ہی

اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مگر مائیں چونکہ خود نہیں جانتیں کہ اصلیت کیا ہے کوئی اُوٹ پٹانگ جواب دے دیتی ہیں۔ کبھی وہ اُسے خاموش کرا دیتی ہیں، کبھی بچہ کو یہ کہہ دیتی ہیں کہ یہ کوئی جادو ہے یا کوئی اَور ایسی ہی چیز ہے۔ اِس طرح بچے کا علم سیکھنے کا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ بہترین معلّم بچہ کی ماں ہوسکتی ہے بشرطیکہ ماں خود تعلیم یافتہ ہو۔ ماں تعلیم یافتہ نہ ہو تو بچہ بجائے علم سیکھنے کے جہالت کی باتیں سیکھتا ہے۔ یا علم سیکھنے کی خواہش بالکل ماری جاتی ہے اور وہ ایک بے خواہش اور بے اُمنگ ہستی ہو کر رہ جاتا ہے۔

اِس کے بعد جوانی کا زمانہ آتا ہے۔ کہتے ہیں "جوانی دیوانی" لیکن جتنی قربانی کی روح جوانی کے زمانہ میں پائی جاتی ہے اُتنی قربانی کی روح نہ بچپن میں پائی جاتی ہے نہ بڑھاپے میں پائی جاتی ہے۔ بچہ ڈرتا بہت ہے اور بوڑھا سوچتا بہت ہے لیکن جوان کام بہت زیادہ کرتا ہے۔ وہ نہ اِتنا ڈرتا ہے جس سے کام خراب ہو جائے اور نہ اِتنا سوچتا ہے کہ سوچتے سوچتے کام کا وقت نکل جائے۔ قوتِ عمل اُس میں پورے زور اور پورے شباب پر پائی جاتی ہے۔ اِس کے بعد بڑھاپا آتا ہے۔ بڑھاپے میں نہ بچے کی سی سیکھنے کی خواہش ہوتی ہے نہ نوجوانوں جیسی قوتِ عمل پائی جاتی ہے۔ وہ عادی ہو جاتا ہے اُن چیزوں کو دیکھنے کا جن چیزوں کے متعلق اُسے سوچنا چاہیے تھا، جن پر اُسے غور کرنا چاہیے تھا اور جن کے متعلق اُسے فکر سے کام لینا چاہیے تھا اور ایک پرانی عادت کی وجہ سے اور بار بار ان چیزوں کو دیکھنے کی وجہ سے اُس کے سیکھنے اور غور وفکر کرنے کی حِس ماری جاتی ہے۔ وہی چیز جو بچہ کے لیے عجوبہ ہوتی ہے اور واقع میں عجوبہ ہوتی ہے وہ ایک بڈھے کے لیے کوئی سوچنے والی بات نہیں ہوتی۔ بچہ اپنی ماں سے پوچھتا ہے کہ سورج اِدھر سے کیوں نکلتا ہے اور اُدھر کیوں ڈوبتا ہے؟ وہ سمجھتا ہے کہ اِدھر سے نکلنے کی کوئی وجہ ہونی چاہیے اور اُدھر ڈوبنے کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ مگر بڈھا سمجھتا ہے اِدھر سے سورج نکلا ہی کرتا ہے اور اُدھر سورج ڈوبا ہی کرتا ہے حالانکہ اگر اِدھر سے سورج نکلا ہی کرتا ہے اور اُدھر سورج ڈوبا ہی کرتا ہے تب بھی اس کے نکلنے اور ڈوبنے کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ مگر چونکہ وہ بار بار یہ دیکھتا رہا کہ سورج اِدھر سے نکلتا ہے اور اُدھر غروب ہوتا ہے اِس لیے رفتہ رفتہ اُس کے سوچنے اور غور وفکر کرنے کی حِس ہی ماری گئی اور وہ سمجھنے لگا کہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ حالانکہ یا تو اُسے یہ بتانا چاہیے کہ اُسے پتہ لگ گیا ہے کہ سورج اِدھر سے کیوں نکلتا ہے اور اُدھر کیوں ڈوبتا ہے یا اُسے یہ کہنا چاہیے کہ اِس کی کوئی وجہ نہیں۔

ورنہ اگر دس کروڑ دفعہ بھی سورج ایک طرف سے نکلے اور دس کروڑ دفعہ بھی دوسری طرف غروب ہو تب بھی یہ کوئی جواب نہیں کہ سورج ادھر سے نکلا ہی کرتا ہے یا سورج اُدھر غروب ہی ہوا کرتا ہے۔ اُسے بتانا پڑے گا کہ اِس نکلنے اور ڈوبنے کی فلاں وجہ ہے۔ یا یہ کہنا پڑے گا کہ اِس کا نکلنا اور ڈوبنا بلا وجہ ہے۔ لیکن بچہ اِن باتوں پر غور کرتا اور صحیح حقیقت معلوم کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ برسات کے موسم میں رات کے وقت لیمپوں پر پروانے گرنے شروع ہوتے ہیں۔ ایک بڈھے کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ پروانے کہاں سے آ گئے ہیں۔ لیکن بچہ جب پہلی دفعہ پروانوں کو دیکھتا ہے تو وہ حیران ہو کر کہتا ہے کہ یہ کہاں سے آ گئے ہیں؟ کیوں نکلے ہیں اور چراغ کے گرد کیوں گرتے ہیں؟ یہی سوال ہے جو علمِ طبیعات اور علمِ حیوانات کے ماہر کے دل میں بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ اِس کا جواب دیتا ہے۔ وہ جواب صحیح ہے یا غلط ہے اُس سے بحث نہیں۔ بہرحال وہ اِس کی کوئی نہ کوئی وجہ قرار دیتا ہے۔ لیکن ماں بوجہ اِس کے کہ اُسے خود علم نہیں ہوتا جب بچہ اُس سے سوال کرتا ہے تو وہ کہہ دیتی ہے بچہ! یوں ہی ہوا کرتا ہے۔ اِسی طرح پروانے نکلتے اور اِس طرح لیمپوں پر گرا کرتے ہیں۔ بچہ اِس جواب پر حیران ہوتا ہے کیونکہ وہ یہی تو پوچھنا چاہتا تھا کہ پروانے کیوں نکلتے ہیں، کیوں لیمپ پر گرا کرتے ہیں۔ اگر وہ اِسی طرح نکلتے اور اِسی طرح گرا کرتے ہیں تب تو ان کے نکلنے اور گرنے کی ضرور کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ مگر ماں کے نزدیک چونکہ وہ اِسی طرح نکلتے اور اِسی طرح لیمپوں پر گرتے ہیں اِس لیے اُن کے نکلنے اور گرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور بچہ کے نزدیک یہی فعل تقاضا کرتا ہے کہ ان کے نکلنے کی کوئی وجہ ضرور ہو۔ اِسی طرح ان کے لیمپ پر گرنے کی بھی کوئی وجہ ضرور ہو۔ یہ فرق اِسی لیے ہے کہ بچے کا دماغ علم کی طرف جا رہا ہوتا ہے اور ماں کا دماغ جہالت کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ بڈھا کسی چیز کی کُنہہ اور حقیقت معلوم کرنے سے تھک جاتا ہے اور وجوہات دریافت کرنے کی حِس اُس کے اندر نہیں رہتی اور جب اُس سے کسی چیز کے متعلق دریافت کیا جائے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو وہ بِالعموم یہی جواب دیتا ہے کہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ لیکن باوجود اِس کے جتنا عرصہ اُس نے سوچا تھا جتنے سوالات اُس کے دل میں پیدا ہوئے تھے، جتنی جوانی کی اُمنگیں اُس کے قلب میں موجزن ہوئی تھیں۔ ان ساری چیزوں نے ایک خلاصہ نکال کر اُس کے دماغ میں رکھا ہوا ہوتا ہے اور سوچ سمجھ کر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی اہلیت اُس میں پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ بہت سی چیزوں کو جہاں عادتاً ترک کر دیتا ہے یا ان کے متعلق سوچتا نہیں

وہاں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں اُس نے ایک مناسب رائے قائم کرنی ہوتی ہے۔
گویا بڑھاپا عقل کا زمانہ ہے، جوانی عمل کا زمانہ ہے اور بچپن سیکھنے کا زمانہ ہے۔ بچپن کی عمر میں انسان جوانی اور بڑھاپے کی خوبیوں سے محروم ہوتا ہے۔ جوانی میں عام طور پر بچپن اور بڑھاپے کی خوبیوں سے محروم ہوتا ہے اور بڑھاپے میں جوانی اور بچپن کی خوبیوں سے محروم ہوتا ہے۔ لیکن اِس میں ایک استثناء بھی ہے اور وہ یہ کہ خدا کا بندہ یعنی سچا اور حقیقی مومن ان ساری چیزوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے۔ اس کا بڑھاپا اُسے قوتِ عمل سے محروم نہیں کرتا۔ اور اُس کی جوانی اُس کی سوچ کو ناکارہ نہیں کر دیتی۔ بلکہ جس طرح بچپن میں جب وہ ذرا بھی بولنے کے قابل ہوتا ہے سوالات سے اپنی ماں کو دِق کر دیتا ہے۔ اُسی طرح اس کا بڑھاپا بھی علوم سیکھنے میں لگا رہتا ہے۔
اِس کی موٹی مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ذات میں ملتی ہے۔ آپ کو پچپن چھپن سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے الہاماً فرمایا کہ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا 1 یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تیرے ساتھ ہمارا سلوک ایسا ہی ہے جیسے ماں کا اپنے بچہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ تُو دیکھتا ہے کہ کس طرح بچہ کُود کُود کر اپنی ماں سے سوال کرتا ہے کہ یہ کیوں ہے وہ کیوں ہے؟ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تُو اِس وقت پچپن ساٹھ سال کی عمر میں ہے مگر اِس عمر میں جہاں دوسرے لوگ بے کار ہو جاتے ہیں اور زائد علوم اور معارف حاصل کرنے کی خواہش اُن کے دلوں سے مٹ جاتی ہے اور اُن کو کہنے کی عادت ہو جاتی ہے کہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے تجھے ہماری ہدایت یہ ہے کہ تُو ہمیشہ خدا تعالیٰ سے دعا کیجیئو کہ خدایا! میرا علم اَور بڑھا، میرا علم اَور بڑھا۔ چنانچہ دیکھ لو آخر اسلام نے کونسی ایسی نئی بات پیش کی ہے جو فطرت میں موجود نہیں تھی۔ سب چیزیں موجود تھیں سوائے چند مسائل کے جو خدا تعالیٰ کی ہستی یا اُس کی صفات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ باقی سارے مسائل خواہ عبادات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں یا معاملات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں فطرتی مسائل ہیں۔ نئی ایجادیں نہیں پھر کیوں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معاملات میں بنی نوع انسان کی راہنمائی کی اور کس ذریعہ سے وہ پیشوا بن گئے؟ اِسی لیے کہ آپ ہر وقت رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا کی دعا مانگتے رہتے تھے۔ آپ نے کسی چیز کو اِس لیے نہیں دیکھا کہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے بلکہ اِس لیے دیکھا کہ ایسا کیوں ہے؟ اور جب آپ نے ہر چیز کے متعلق غور کیا کہ ایسا کیوں ہے یا کیا ہونا چاہیے تو آپ کو ایسی راہنمائی عطا ہوئی جس سے آپ کا علم صبح شام بلکہ ہر گھنٹہ اور ساعت کے بعد بڑھتا چلا

گیا۔ مزید بات یہ ہے کہ خود سوچنے اور غور کرنے کے علاوہ آپؑ اللہ تعالیٰ سے بھی سوالات کرتے گئے (جیسے بچہ اپنی ماں سے سوالات کرتا ہے) کہ خدایا! مجھے اِس کی بھی وجہ بتا اُس کی بھی وجہ بتا۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھ لو۔ آپ بڑی عمر کے آدمی تھے مگر پھر بھی کہتے ہیں رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى[2] دنیا کے لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ احیائے مَوْتٰی پر کبھی غور ہی نہیں کرتے۔ نہ جسمانی زندگی اُنہیں عجوبہ معلوم ہوتی ہے نہ حیوانی زندگی اُنہیں عجوبہ معلوم ہوتی ہے۔ ہزاروں سال سے زندگی کا دَور چلا آ رہا ہے مگر یہ کبھی غور نہ کیا گیا کہ انسان کی زندگی کس طرح شروع ہوئی ہے۔ اِس زمانہ میں صرف ڈارون (Darwin) کی ایک مثال ہے۔ اُس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ زندگی کس طرح ظاہر ہوئی ہے اور وہ کیا کیا مدارج ہیں جن میں سے انسان گزرا ہے۔ اس کی تحقیق غلط تھی یا صحیح بہرحال اُس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا اور اُس کے بعد ساری دنیا میں ایک رَو چل گئی کہ دیکھیں دنیا کس طرح پیدا ہوئی ہے۔ اِسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى[2] گویا وہی خیال جو دُنیوی اور مادی لوگوں کے دلوں میں ڈارون کے زمانہ میں پیدا ہوا آج سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ اور اُنہوں نے کہا رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى[2] اے میرے رب! یہ بے جان مادہ کس طرح زندہ ہوجایا کرتا ہے؟ ڈارون نے تو مادی احیاء کے متعلق سوال کیا تھا لیکن ابراہیم علیہ السلام کو مادی زندگی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اُسے روح کی زندگی مطلوب تھی۔ جسمانی تغیرات سے تعلق رکھنے والے اُمور اُس نے سائنسدانوں کے لیے چھوڑ دیئے اور سمجھا کہ میرا کام صِرف اتنا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے یہ پتہ لگاؤں کہ ارواح کس طرح زندہ ہوا کرتی ہیں۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ابراہیمؑ تُو پچاس ساٹھ سال کا ہو چکا ہے، اب یہ بچوں کی سی باتیں چھوڑ دے۔ بلکہ اُس نے بتایا کہ ارواح کس طرح زندہ ہوا کرتی ہیں۔ ابراہیم سمجھتا تھا کہ مَیں اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک بچہ کی سی حیثیت رکھتا ہوں۔ جس طرح بچہ حق رکھتا ہے کہ اپنی ماں سے سوالات کرے اُسی طرح میرا بھی حق ہے کہ مَیں اللہ تعالیٰ سے سوالات کروں اور جس چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو اُس کی حقیقت دریافت کروں۔ چنانچہ اُس نے کہا اللہ میاں! مجھے یہ بتا دیجیے کہ روحیں کس طرح زندہ ہوتی ہیں؟

غرض مومن کی زندگی میں بچپن بھی ہوتا ہے اور بڑھاپے کی حالت میں بھی علم سیکھنے، علم کی کُرید کرنے اور علم کے حاصل کرنے سے وہ غافل نہیں ہوتا بلکہ اِس سے وہ ایک لذت اور سرور حاصل کرتا ہے۔ اِس کے مقابلہ میں جب انسان پر ایسا دَور آتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ مَیں نے جو کچھ سیکھنا تھا سیکھ لیا ہے۔ اگر مَیں کسی امر کے متعلق کوئی سوال کروں گا تو لوگ کہیں گے کیسا جاہل ہے۔ اِسے ابھی تک فلاں بات کا پتہ ہی نہیں تو وہ علم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

حضرت خلیفہ اول سنایا کرتے تھے کہ جب آپ مہاراجہ کشمیر کے دربار میں طبیب مقرر ہوئے تو جاتے ہی بعض علاج نہایت کامیاب ہوئے جن سے آپ کی شُہرت لوگوں میں خوب پھیل گئی۔ کچھ اِس وجہ سے بھی شہرت تھی کہ آپ ہندوستان سے علمِ طب پڑھ کر گئے تھے۔ آپ کی عمر اس وقت زیادہ نہ تھی مگر پھر بھی ساری ریاست میں آپ کا شہرہ ہو گیا اور مہاراجہ بھی آپ کا بڑا ادب اور لحاظ کرتا۔ آپ فرماتے تھے ایک دن مجھے خیال آیا کہ یونانی طب تو پڑھ ہی لی ہے ویدک طب بھی پڑھ لوں۔ اِس سے علم کی زیادتی ہی ہوگی۔ مَیں نے پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ ایک پنڈت نے ویدک طب پڑھی ہوئی ہے مگر وہ پنڈت 15 روپے پر دربار میں معمولی ملازم تھا جیسے دفتری ہوتے ہیں۔ آپ فرماتے تھے مَیں نے اُسے بلایا، اُس کی تنخواہ مقرر کی اور اُس سے ویدک طب پڑھنی شروع کر دی۔ چونکہ ریاست میں آپ کے حاسد بھی پیدا ہو گئے تھے اُنہوں نے جب سنا کہ حضرت مولوی صاحب نے ایک پنڈت سے جو معمولی دفتری کی حیثیت رکھتا ہے طب پڑھنی شروع کی ہوئی ہے تو اُنہوں نے سمجھا کہ یہ مہاراجہ کو آپ کے خلاف بھڑکانے کا اچھا موقع ہے۔ ایک دن دربار لگا ہوا تھا کہ انہوں نے مہاراجہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے کہ آپ نورالدین کی بڑی عزت کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ بڑا طبیب ہے حالانکہ اُس کی حالت یہ ہے کہ اُس نے فلاں دفتری سے طب پڑھنی شروع کی ہے۔ اُسے تو طب آتی ہی نہیں۔ مہاراجہ کو اِس پر تعجب ہوا۔ چنانچہ کسی وقت وہ پنڈت کاغذات لے کر دربار میں آیا تو مہاراجہ نے کہا حکیم صاحب! مَیں نے سنا ہے لوگ آپ پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ طب میں آپ کا استاد ہے۔ آپ کہتے تھے مَیں نے اِس پر بڑے ادب سے اُس پنڈت کی طرف اشارہ کر کے کہا حضور واقع میں یہ میرے اُستاد ہیں۔ مَیں اِن سے ویدک طب پڑھتا ہوں۔ اِس صاف گوئی اور حقیقت تسلیم کر لینے کا مہاراجہ پر اِتنا اثر ہوا کہ بجائے اِس کے کہ وہ بدظن ہوتا اُس کی نگاہ میں آپ کی قدر و منزلت اَور بھی بڑھ گئی اور وہ اعتراض

کرنے والوں پر خفا ہوا اور اُس نے کہا بڑے آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دیکھو! اُن کو ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ مَیں ایک معمولی آدمی سے طب پڑھتا ہوں بلکہ اُنہوں نے برملا اُس کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ تو علم حاصل کرنے کی خواہش مومن کے اندر ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔ وہ کبھی یہ خیال نہیں کرتا کہ اگر مَیں نے کوئی بات پوچھی تو لوگ کہیں گے یہ اِتنا بڑا عالم بنا پھرتا تھا مگر اسے فلاں بات بھی معلوم نہیں۔ وہ پوچھنے اور علم حاصل کرنے کی خواہش کے لحاظ سے باوجود اُستاد بن جانے کے ہمیشہ شاگرد رہتا ہے اور نہ صرف لوگوں سے علم حاصل کرتا ہے بلکہ خدا تعالیٰ سے بھی یہی کہتا ہے کہ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔

دوسرے مومن کے اندر ہمیشہ جوانی والی قوتِ عملیہ پائی جانی چاہیے۔ بوڑھا ہونے کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ انسان ناکارہ ہو جائے اور کام کرنے سے اُسے چھٹی مل جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تریسٹھ سال کی عمر میں فوت ہوئے تھے مگر اِس عمر میں بھی جہاد اور دوسرے تمام قومی کاموں میں آپ حصہ لیتے تھے اور یہی اللہ تعالیٰ کے تمام مومن بندوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ خدا کے بندے کبھی پنشن نہیں لیتے۔ یہ دنیادار لوگوں کے خیالات ہوتے ہیں کہ اب پنشن کا زمانہ آ گیا ہے۔ خدا تعالیٰ کے بندے اِس دنیا میں کبھی آرام نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اُن کے لیے آرام کا مقام مرنے کے بعد ہے۔ اگلے جہان میں فرشتے انسان کی خدمت میں لگے رہیں گے اور انسان ذکرِ الٰہی کرے گا۔ لیکن اِس جہان میں بندے خدمت میں لگے رہتے ہیں اور ان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی ترقی میں حصہ لیں اور ایسے کام کریں جن سے لوگوں کی فلاح و بہبود وابستہ ہو۔ غرض مومن بڑھاپے میں قوتِ عمل کے لحاظ سے جوان ہوتا ہے اور جوانی میں عقل اور تجربہ کے لحاظ سے بڈھا ہوتا ہے۔ اور پھر جوانی اور بڑھاپے کی کسی حالت میں بھی وہ علم سے محرومی برداشت نہیں کرسکتا۔ جس شخص میں یہ تین خوبیاں پائی جائیں یعنی وہ جوانی میں بڈھا بھی ہو اور بچہ بھی اور بڑھاپے میں جوان بھی ہو اور بچہ بھی وہ کبھی ذلت اور رسوائی کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ ہر شخص جو دنیا میں عزت کا کوئی مقام حاصل کرتا ہے اس میں یہ تین خوبیاں ضرور پائی جاتی ہیں۔ علم بڑھانے کی خواہش اُس میں انتہا طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ بِلا وجہ کسی بات کو نہیں مانتا بلکہ ہر چیز کی کُنہہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اُس میں قوتِ عملیہ ہوتی ہے اور وہ ہر قربانی کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ پھر اُس میں تدبّر اور سوچ بچار اور غور و فکر کا مادہ پایا جاتا ہے اور

جلد بازی سے وہ کام کو خراب نہیں کر دیتا۔ جب کسی شخص میں یہ تین خوبیاں جمع ہو جائیں وہ اللہ تعالیٰ کا کامل مومن بندہ بن جاتا ہے۔ ایسا بندہ جو دنیا کا سہارا ہوتا ہے اور جو دنیا کو تباہی سے بچانے کا ذریعہ اور اُن کے دکھوں کا علاج اور مداوا ہوتا ہے۔ بچپن میں یہ تینوں باتیں جمع نہیں ہوتیں کیونکہ وہ معذوری کا زمانہ ہوتا ہے۔ لیکن جب سے معذوری کا زمانہ جاتا رہتا ہے اور احکامِ شرعیہ پر عمل کرنے کا وہ مکلّف ہوتا ہے اُس وقت سے اِن تینوں باتوں کا اُس میں جمع ہونا ضروری ہوتا ہے۔ صرف بچپن کا زمانہ ایسا ہے جس کو ہم مستثنٰی کر سکتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے ہیں اَلصَّبِيُّ صَبِيٌّ وَ لَوْ كَانَ نَبِيًّا 3 بچہ بچہ ہی ہے خواہ وہ بعد میں نبی ہی کیوں نہ بن جائے۔

ہماری جماعت کو بھی یہ تینوں باتیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہر عمر میں علم سیکھنے کی تڑپ اُس کے اندر ہونی چاہیے۔ جب تک علم سیکھنے کی تڑپ نہ ہو اُس وقت تک انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ مگر علم سیکھنے کے معنے کج بحثی کے نہیں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ نوجوانوں میں یہ نقص پایا جاتا ہے کہ وہ جواب پر غور نہیں کرتے اور کج بحثی شروع کر دیتے ہیں۔ یا ایسی گفتگو کرتے ہیں جو اُن کی پراگندہ دماغی کا ثبوت ہوتی ہے۔ مثلاً ذکر ہوگا موت کا تو وہ سوال کر دیں گے بچہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ یا ذکر ہوگا بچہ پیدا ہونے کا تو وہ بات سن کر کہہ دیں گے جنت میں حوریں کیسی ہوں گی؟ پتہ ہی نہیں لگتا کہ وہ کس جہت کی طرف جا رہے ہیں۔ جیسے چڑیا پھُدکتی ہے یا جیسے بندر ایک شاخ سے پھُدک کر دوسری شاخ پر چلا جاتا ہے یہی حال اُن کے دماغ کا ہوتا ہے حالانکہ ہر چیز میں انسان کو سمویا جانا چاہیے۔ جب وہ کسی چیز کی طرف مائل ہو تو وہ اُس کے سیاق وسباق کو دیکھے، اُس کے بواعث کو دیکھے، اس کے نتائج کو دیکھے اور پھر کوئی گفتگو کرے۔ غرض خیالات پر قبضہ اور تصرّف نہایت ضروری ہے۔ اِس کے بغیر کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو شخص صرف پھُدکنا جانتا ہے وہ اپنے اندر علم جذب نہیں کر سکتا۔ علم جذب کرنے والا ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف انتقال کرنے میں کچھ وقت چاہتا ہے۔ مگر اِس کے یہ معنے بھی نہیں کہ تم ایسے بن جاؤ جیسے افیونی ہوتا ہے اور جسے دوسری جہت کی طرف لے جانے کے لیے بہت بڑی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا انسان بھی کسی کام کے قابل نہیں ہوتا جسے ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف جانے کے لیے مدتیں درکار ہوں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ خیالات کی رَو کو اِس طرح توڑ دینا کہ بات کوئی شروع ہے اور سوال کوئی کیا جا رہا ہے بتاتا ہے کہ دماغ میں سنجیدگی نہیں۔

پس ایک طرف علم سیکھنے کی ہماری جماعت کو زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے اور دوسری طرف اپنی قوتِ عملیہ کو مضبوط کرنا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہماری جماعت میں قوتِ عملیہ بہت کم پائی جاتی ہے حالانکہ جب تک قوتِ عملیہ نہ ہو کوئی قوم اپنی کوششوں کے اعلیٰ نتائج نہیں دیکھ سکتی۔ اِسی طرح نوجوانوں میں تدبّر اور فکر کی عادت ہونی چاہیے۔ جوانی جوش کا تقاضا کرتی ہے اور بڑھاپا حکمت اور تدبّر کا متقاضی ہوتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عقل اور تدبر سے جو بات ہوتی ہے وہی کامیابی کا موجب ہوتی ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں آجکل کے نوجوان سیاسیات اور دوسرے امور میں فوراً حصہ لینے لگ جاتے ہیں حالانکہ اُن کی سمجھ ابھی پختہ نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے خیالات کی رَو غلط طریق پر چل پڑتی ہے اور ملک کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

پس یہ تین چیزیں اپنے اندر پیدا کرو۔ ایک ہی وقت میں تمہارے جوان بچے بھی ہوں اور بوڑھے بھی۔ اور تمہارے بوڑھے بچے بھی ہوں اور جوان بھی۔ اور اگر ممکن ہو سکے تو تمہارے بچے بھی ایک ہی وقت میں جوان بھی ہوں اور بوڑھے بھی۔ جب یہ تینوں چیزیں تمہارے اندر پیدا ہو جائیں گی تو تمہاری زندگی کے سارے پہلو محفوظ ہو جائیں گے۔ دوسرے اِس کا یہ بھی نتیجہ ہوگا کہ کوئی دو گروہ ہماری جماعت میں پیدا نہیں ہوسکیں گے۔ یہ جو لوگ کہا کرتے ہیں کہ جوانوں کے لیے جگہ خالی کرو یہ عام سیاسی دنیا کے خیالات ہیں۔ ہمارے اندر یہ خیالات پیدا نہیں ہونے چاہییں۔ تم اپنے اندر ایسی خوبیاں پیدا کرو کہ ہماری قوم میں جس کو دنیا جوان کہتی ہو وہ بچہ اور بوڑھا بھی ہو اور جس کو دنیا بوڑھا کہتی ہو وہ جوان اور بچہ بھی ہو۔ اور جس کو دنیا بچہ کہتی ہو وہ جوان اور بوڑھا بھی ہو۔ جب تمہارا ہر جوان بوڑھا ہوگا اور تمہارا ہر بوڑھا جوان ہوگا اور ہر بچہ جوان اور بوڑھا ہوگا تو جماعت کی زندگی میں ایسی یکجہتی پیدا ہو جائے گی جس سے اِفتراق اور اِنشقاق کی کوئی صورت بھی باقی نہیں رہے گی"۔

(الفضل 23 جون 1948ء)

1: طٰہٰ: 115

2: البقرة: 261

3: موسوعة امثال العرب جزء رابع زیرحرف ''ص'' میں ''الصبیّ صبیًّا ولَقِیَ النَّبِیَّ'' کے الفاظ ہیں۔